

محبوب سندھی کی چند اہم نامی باتیں

(سعید احمد کبیر آبادی)

کسی قوم یا ملک کے معاملات و مسائل پر جو لوگ غور کرتے اور اس کی پیچیدہ و گہری باتوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو پیش نظر مشکلات و مسائل کا حل سوسائٹی کے عام قوانین اور مرد و عورت و رسم و رواج کی حد بند یوں کے اندر محصور رہ کر سوچتے ہیں اور اس بنا پر ان کی زبان و قلم سے کبھی کسی ایسے فکر کا ترشح نہیں ہوتا جو لوگوں کے عام معتقدات مذہبی و انکارِ قومی کی دنیا میں کوئی ہنگامہ برپا کر سکے اس قسم کے حضرات سچ پچ غالب کے اس شعر کا مصداق ہوتے ہیں یہ

ہیں اہلِ خرد کس نہشِ خاصِ نیازاں پابستگیِ رسمِ درہِ عام بہت ہے

اس کے برخلاف مفکرین کا ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جو انقلابی ذہن سے ان مسائل کا حل سوچتا ہے اور اگر اس حل کی راہ میں پرانے اور مرد و عورت و رسوم کی کسی خاص مہبت و وضع کو صدمہ بھی پہنچتا ہے تو وہ اس کی ذرا پرواہ نہیں کرتا چونکہ ہر حال اپنے ماضی کا قدرتی اور طبعی نتیجہ ہوتا ہے اس لئے اس قسم کا مفکر ماضی کا مطالعہ بے تعصبی سے غور و خوض کے ساتھ کرتا ہے اس کی تحلیل کر کے چند اصول متعین کرتا ہے اور پھر ان اصول کی روشنی میں حال اور اس سے آگے بڑھ کر مستقبل کے معاملات و مسائل پر نگاہ ڈالتا ہے اس سلسلہ میں وہ یہ معلوم کر لینا ہے کہ ماضی کی تعمیر کے اصل خد و خال کیا ہیں اس کی مہبت کن ذاتی یا کن عناصر کو عناصر حقیقی کی حیثیت حاصل ہے اور اس میں کون سی اور کتنی چیزیں ایسی ہیں جو کسی عمارت میں موسمی تغیرات کی مانند کسی خاص خارجی سبب کے باعث پیدا ہو گئی

ہیں پھر اس ویدہ دری کے ساتھ اُس میں اتنی جرأت و جسارت بھی ہوتی ہے کہ وہ دخت کی غیر مزدوری اور فضول شاخوں کو کاٹ کر پھینک دیتا ہے اور اس طرح اپنی حقیقت نمائی واقفیت پر دری کے چہرہ کو رسم پرستی کے داغ سے محفوظ کر لیتا ہے اُس کی طبیعت کی یہ افتاد اور اُس کے فکر کا یہ طریق اس کو اس درجہ روشن و ماخ۔ عالی حوصلہ اور وسیع انظر بنادیتا ہے کہ حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اُس کا فکر بھی بدلتا رہتا ہے اس کی طبیعت میں جو نہ نہیں ہوتا اُس کا ذہن رحمت پسندی کے عیب سے پاک ہوتا ہے وہ بُرائی لکیر کا فقیر نہیں بنا رہتا بلکہ اس کی مثال اس طبیبِ حاذق کی سی ہوتی ہے جو مرض کی نوعیت اور موسم کے اثرات کے بدلنے سے بدلنے کے ساتھ نسخہ کے اجزاء میں بھی ترمیم و تہتیک کرتا ہے اور ہر مرض کے لئے ایک ہی نسخہ اور ایک ہی دوا تجویز نہیں کرتا۔ اس دوسری قسم کا مفکر سی درحقیقت انقلابی مفکر کہلاتا ہے اور پہلی قسم کے مفکر کو رحمت پسند کہنا چاہئے۔ مولانا عبد اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ میں اسی دوسری قسم کے واحد انقلابی مفکر تھے اور اپنی اس حیثیت میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ان کے علاوہ اس دور میں جتنے مسلمان زعماء اور مفکر پیدا ہوئے وہ سب مولانا ابوالکلام آزاد سے لے کر خدا وندان جمعیت تک اپنے علمی و عملی کمالات و اوصاف کے باعث مسلمانوں کے خواہ کتنے ہی لائق تعظیم و احترام رہنا ہوں لیکن افسوس ہے انہیں انقلابی مفکر نہیں کہا جاسکتا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا چونکہ انقلابی مفکر کے ذہن میں جمود نہیں ہوتا اور وہ عوامیہ کی حد بندیوں سے آزاد ہو کر معالجات و مسائل پر غور کرتا اور اُن کا حل سوچتا ہے اس لئے ابتداءً سوسائٹی کا مزاج اس کے فکر کو قبول کرنے سے عمومی طور پر انکار کرتا ہے اور رحمت پسند و قدامت پرست طبائع اس پر سب دشمن کی پوچھا شروع کر دیتی ہیں۔ مذہب کی زبان میں گفتگو کرنے والے اس کو ملحد اور زندقہ کہتے ہیں ساجی آداب کی اصطلاح میں اس کو رند مشرب یا آزاد و خجل کہا جاتا ہے اور جو لوگ اس کی عظمت کا انکار نہیں

نہیں کہنے کے جوہر دیئے گئے۔ باعث اس کے افکار کے ساتھ ہم آہنگی بھی نہیں کرتے وہ کبھی دے دے لفظوں میں اور کبھی عمل کر اسے مجذب یا دیوانہ کہتے ہیں چنانچہ مولانا علیہ السلام کے سندھی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا کہنے والوں نے انھیں کیا کچھ نہیں کہا یہاں تک کہ جو سالہا سال کے رفیق تھے اور مولانا کی دماغی و عملی عظمت کا انکار نہیں کر سکتے تھے انھوں نے بھی کبھی اُن کو مجذب کہا اور کبھی دیوانہ کہہ کر پکارا ان حضرات کی رعایت سے ہم نے بھی اس مقالہ کے عنوان میں مولانا سندھی کو مجذب سندھی ہی کہا ہے۔

مولانا اپنے افکار کی ہمہ گیر عظمت اور اس کی انقلابیت کے باعث اسلام کی نام قریب کی تاریخ کے نام مفکرین اسلام میں نہ صرف ایک قومی بلکہ بین الاقوامی مفکر کی حیثیت سے کتنا اونچا مقام رکھتے ہیں اور ان کے افکار کی بنیاد پر اسلام کو کس طرح بد کامیاب ترین بین الاقوامی دستور زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے اور اس کے زیر اثر دنیا میں کس طرح ایک صالح ترین نظام زندگی برپا کیا جا سکتا ہے؟ ان سب سوالات کا جواب تو آپ کو اس زیر تالیف ضخیم کتاب میں ملے گا جو اگر پوری ہوگا تو اس پر خاکسار مولف کو فخر سے یہ کہنے کا موقع ہوگا کہ

شادم از زندگی خویش که کارے کردم!!

البتہ اس مختصر مقالہ میں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لوگوں نے جس کو کل مجذب یا دیوانہ قرار دیا آج اس کی جدید پیش گوئیاں جو ان لوگوں کے نزدیک ”مجذب کی بڑ“ سے زیادہ درست نہیں رہتی تھیں کس کس طرح حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں اس کے مطالعہ سے ملاحظہ ہو گا کہ جو لوگ رحمت پسندی کے ساتھ قومی و ملکی معاملات پر سوچ بچار کرتے ہیں انھیں کیوں کر اپنے منصوبوں میں ناکامی ہونی ہے اور اس کے برخلاف جو وسیع النظر اور انقلابی ذہن کا مظہر حالات و واقعات کا ہمہ گیر جائزہ لینے کے بعد ان کی رفتار کے بعد لینے کے ساتھ بہت بھر کا طریق اور فائدہ میسر آتا ہے۔ واقعات کے نتائج انجام کار کس طرح اس کے

فکر کی صداقت کو ثابت کر دکھاتے ہیں۔

جنگ عظیم دوم | مولانا ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ تک جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے کے بعد مقتلہ میں ہندوستان تشریف لائے تھے، کراچی اترے اور وہاں سے سیدھے دہلی پہنچے دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہمان خانہ واقع قریب باغ میں قیام پذیر ہوئے۔ تعلق خاطر کے باعث زندۃ المصنفین کے دفتر میں بھی اکثر تشریف لائے تھے اور مختلف عنوانات پر مباحثہ پر گفتگو فرماتے تھے، ایک دن ارشاد ہوا منبر کے یقین میں ایک جنگ عظیم عنقریب چھڑنے والی ہے جس میں روس بھی شریک ہوگا اور اگر جنگی اعتبار سے فتح اس فریق کو ہوگی جس کا حلیف روس ہوگا لیکن اس جنگ کے بعد دنیا کا نظام بالکل بدل جائے گا اور کمیونزم کو اس درجہ ذریعہ ہوگا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے دراصل جیت روس کی ہی ہوگی۔ میں نے کہا مولانا جرمنی کا کیا ہوگا؟ یہ بھی تو دنیا کی ایک عظیم اشان طاقت ہے اور اگر اٹلی اور جاپان روس کے حلیف ہو گئے تو کیا یہ سب مل ملا کر بھی فتح حاصل نہ کر سکیں گے؟ مولانا نے اپنی عادت کے مطابق شانِ جلالی کے ساتھ تپائی پر زور سے ہاتھ مار کر فرمایا ہوں! جرمنی! اس نے اگر روس کی مخالفت کی تو پاش پاش ہو جائیگی اور ہٹلر اور مسولینی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔ پھر پوچھا گیا مگر مولانا امریکہ اور برطانیہ کا انجام کیا ہوگا؟ ارشاد ہوا ”انڈیا لوجی کے اعتبار سے امریکہ برطانیہ اور روس دونوں ایک دوسرے کی ضد میں اور اس بنا پر یہ مشکل سے ہی باہر کیا جاسکتا ہے کہ یہ تینوں جنگ میں ایک دوسرے کے حلیف ہوں گے لیکن جہاں تک سیاسی شرائط انچالیا کا تعلق ہے امریکہ اور برطانیہ کو روس پر تفوق حاصل ہے اس لئے بعید نہیں یہ دونوں روس کو اپنے ساتھ ملا لیں اور اس طرح اس کی مدد سے جرمنی کا خاتمہ کر دیں ساتھ ہی فرمایا ”ایک اور بات تمہیں ذہن میں رکھنی چاہئے اور وہ یہ کہ اٹلی اور جرمنی کا نظام فاشسٹ ہے امریکہ اور برطانیہ میں جمہوریت قائم ہے۔ اگرچہ یہ جمہوریت سرمایہ دارانہ ہے لیکن بہر حال

مرد نہ کہ عورتوں کی طرف سے۔ اس کے افکار کے ساتھ ہم آہنگی بھی نہیں کرتے وہ کہے دے دے لفظوں میں اور کبھی کھل کر اسے مجذب و دیوانہ کہتے ہیں چنانچہ مولانا علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا کہ والدوں نے انھیں کیا کچھ نہیں کہا یہاں تک کہ جو انہ سالہا سال کے رفیق تھے اور مولانا کی دماغی و علمی عظمت کا انکار نہیں کر سکتے تھے انھوں نے بھی کبھی ان کو مجذب کہا اور کبھی دیوانہ کہہ کر پکارا ان حضرات کی رعایت سے ہم نے ہم اس مقالے کے عنوان میں مولانا سندھی کو مجذب سندھی ہی کہا ہے۔

مولانا اپنے افکار کی ہمہ گیر عظمت اور اس کی انقلابیت کے باعث اسلام کی قریب کی تاریخ کے نام مفکرین اسلام میں نہ صرف ایک قومی بلکہ بین الاقوامی مفکر کی حیثیت سے کتنا اونچا مقام رکھتے ہیں اور ان کے افکار کی بنیاد پر اسلام کو کس طرح کا مباح ترین بین الاقوامی دستور زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے اور اس زیر اثر دنیا میں کس طرح ایک صالح ترین نظام زندگی برپا کیا جا سکتا ہے؟ ان سے سوالات کا جواب تو آپ کو اس زیر تالیف ضخیم کتاب میں ملے گا جو اگر پوری ہو تو اس پر خاکسار مولف کو فخر سے یہ کہنے کا موقع ہو گا کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

البتہ اس مختصر مقالہ میں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لوگوں نے جس کو کل مجذب و دیوانہ قرار دیا آج اس کی چند پیش گوئیاں جو ان لوگوں کے نزدیک ”مجذب کی بڑ“ سے زیادہ نہیں رکھتی تھیں کس کس طرح حریف و صریح ثابت ہو رہی ہیں اس کے مطالعہ سے ہو گا کہ جو لوگ رجعت پسندی کے ساتھ قومی و ملی معاملات پر سوچ بچار کرتے ہیں انہ کوں کر اپنے منصوبوں میں ناکامی ہوتی ہے اور اس کے برخلاف جو وسیع النظر اور انقلابی خیالات و افکار کا ہمہ گیر جائزہ لینے کے بعد ان کی رفتار کے بدلنے کے بہت بھرپور طریق اور فائدہ دہی بدلتا رہتا ہے۔ واقعات کے نتائج انجام کار کس طرح اس

نکری صداقت کو ثابت کر دکھانے ہیں۔

جنگ عظیم دوم | مولانا ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ تک جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۹۳۷ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے، کراچی اترے اور وہاں سے سیدھے دہلی پہنچے دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یہاں خانہ واقع قریب باغ میں قیام پذیر ہوئے۔ تعلق خاطر کے باعث ندوۃ المصنفین کے دفتر میں بھی اکثر تشریف لائے تھے اور مختلف عنوانات پر مباحثہ پر گفتگو فرماتے تھے، ایک دن ارشاد ہوا میرے یقین میں ایک جنگ عظیم عنقریب چھڑنے والی ہے جس میں روس بھی شریک ہوگا اور اگر جنگی اعتبار سے فتح اس فریق کو ہوگی جس کا حلیف روس ہوگا لیکن اس جنگ کے بعد دنیا کا نظام بالکل بدل جائے گا اور کمیونزم کو اس درجہ ذریعہ ہوگا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے دراصل جیت روس کی ہی ہوگی۔ میں نے کہا تو لانا جرمنی کا کیا ہوگا؟ یہ بھی تو دنیا کی ایک عظیم اشان طاقت ہے اور اگر آئی اور جاپان روس کے حلیف ہو گئے تو کیا یہ سب مل ملا کر بھی فتح حاصل نہ کر سکیں گے؟ مولانا نے اپنی عادت کے مطابق شانِ جلالتی کے ساتھ تپائی پر زور سے ہاتھ مار کر فرمایا ہوں! جرمنی! اس نے اگر روس کی مخالفت کی تو پاش پاش ہو جائیگی اور ہٹلر اور مسولینی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔ پھر پوچھا گیا مگر مولانا بڑے اور برطانیہ کا انجام کیا ہوگا؟ ارشاد ہوا ”انڈیا لوجی کے اعتبار سے امریکہ برطانیہ اور روس دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اس بنا پر یہ مشکل سے ہی باہر کیا جاسکتا ہے کہ یہ تینوں جنگ میں ایک دوسرے کے حلیف ہوں گے لیکن جہاں تک سیاسی شرائط انچاپالائی کا تعلق ہے امریکہ اور برطانیہ کو روس پر تفوق حاصل ہے اس لئے بعید نہیں یہ دونوں روس کو اپنے ساتھ ملا لیں اور اس طرح اس کی مدد سے جرمنی کا خاتمہ کر دیں ساتھ ہی فرمایا ”ایک اور بات تمہیں ذہن میں رکھنی چاہئے اور وہ یہ کہ آئی اور جرمنی کا نظام فاشسٹ ہے امریکہ اور برطانیہ میں جمہوریت قائم ہے۔ اگرچہ یہ جمہوریت سرمایہ دارانہ ہے لیکن بہر حال

فاشیزم کے مقابلہ میں بہتر ہے روس کا نظام کمونزم ہے جو آئندہ چل کر تاریخ اور وقت کے طبعی تقاضے کے باعث ساری دنیا کا نظام بننے والا ہے اس ترتیب کے اعتبار سے ہونا یہ چاہئے کہ پہلے فاشیزم ختم ہو جو ان تینوں میں سب سے زیادہ بُرا نظام ہے۔ اس کے بعد سرمایہ دارانہ جمہوریت اور کمونزم میں جنگ ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان دونوں میں جو صالح تر نظام ہوگا وہ باقی رہ جائے گا اور اس کا حریف ختم ہو جائے گا۔

یہ گفتگو عصر اور مغرب کے درمیان شام کی چاء پر ہو رہی تھی جو کچھ دیر کے بعد رفت گذشت ہو گئی۔ اس کے چند ماہ بعد ہی جنگ شروع ہوئی۔ ہٹلر کی فوجیں طونانی برز و باران کی طرح بڑھتی جا رہی تھیں۔ مشرقی یورپ کے جس ملک کی طرف اُس نے رخ کیا وہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر اس کے قدموں پر گرنا چلا گیا۔ صبح ایک ملک کی باری تھی اور شام دوسرے کی۔ دنیا کے سچے سچے دل پر ہٹلر کی عظمت اور اس کی ناقابل شکست طاقت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو افوار کے دن صبح کے تین بج کر منٹ پر ہٹلر نے خود اپنی اور نازی فاشیزم کی موت کی دستاویز پر دستخط کیے اور سوویت روس کے خلاف اعلان جنگ کر کے اس پر دھاوا بول دیا۔ دنیا کے بڑے بڑے سیاسی مفکر اور فوجی ماہر اس وقت جرمنی کی طاقت سے کس درجہ مرعوب تھے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ”۲۵ جون کے نیوز کرائیکل“ اخبار نے امریکہ کے مشہور فوجی ماہر جیمز فیلڈنگ ایبٹ کا ایک بیان شائع کیا جس میں انھوں نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ سوویت روس کی فوجی اور نظامی طاقت جو کچھ ہے ہم کو معلوم ہے اس کے پیش نظر ہرگز اس بات کی توقع نہیں ہو سکتی کہ روس کی سرخ فوج جرمنی کے جارحانہ حملوں کا مقابلہ کا دیا نہ کے ساتھ کر سکے گی۔“ پھر اسی اخبار میں اس صفحہ پر جو لیڈنگ آرٹیکل نکلا اس میں بھی ایڈیٹر نے لکھا تھا ”جرمنی کے مقابلہ میں روس کی شکست یقینی ہے یہ جنگ زیادہ سے زیادہ موسم خزاں تک چلے گی۔“ فوجی ماہرنا و مصبرین کے علاوہ خود انگریزوں میں رائے عامہ کیا تھی؟ ڈین آف کینٹربری اپنی مشہور کتاب

(The social and sexual world) میں لکھتے ہیں ”روس پر جرمنی کے حملہ کے وقت انگلینڈ میں ہر شخص گورنمنٹ اور محکمہ خارجہ کے ذمہ دار افسروں اور عہدہ داروں سے لے کر نیچے طبقہ کے مزدوروں تک ہر اخبار نویس - ہر فوجی ماہر اس بات کی توقع کرتا تھا کہ سرخ فوج کو مکمل شکست ہوگی اور سوویت یونین بالکل تباہ و برباد ہو جائیگی شروع شروع میں ان لوگوں کا یہ خیال جو ایک طرف جرمنی طاقت سے غیر معمولی مرغوبیت اور دوسری جانب روس اور فن لینڈ کی طوالت جنگ کے باعث روس کی طاقت کی طرف سے غلط فہمی پر مبنی تھا صحیح ثابت بھی ہوا چنانچہ جرمنی نے روس کے علاقوں کو ہال کرتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی فوجوں نے ماسکو کے دروازہ پر دستک دی اور ماسکو گورنمنٹ کو وہاں سے منتقل ہو جانا پڑا۔ اب کسی کو شبہ نہیں تھا کہ نپولین بونا پارٹ بھی جس مرکز کو سر انجام نہیں کر سکا تھا جرمنی کا فیوہرر چند دنوں میں اسے ختم کر کے رکھ دے گا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ مولانا سندھی دفتر برہان میں تشریف لے آئے۔ میں نے عرض کیا حضرت! آپ کا یہ خیال تو صحیح نکلا کہ امریکہ اور برطانیہ کی شاطرانہ چال کامیاب ہوئی اور اس نے روس کو بھی جرمنی کے مقابلہ میں لاکھڑا کیا۔ لیکن آپ جو روس کی طاقت کی طرف سے اس درجہ خوش گمان تھے وہ واقعات کی روشنی میں غلط ثابت ہو رہا ہے سرخ فوجیں ہر مورچہ پر پٹ رہی اور پسپا ہو رہی ہیں اور ہٹلر کی فوج ان کے علاقوں کو روندتی ہوئی بھی چلی جا رہی ہے! مولانا کو اپنے دل و دماغ کے مشاہدہ پر ایسا جزم و یقین تھا کہ یہ سُننے ہی پہر بڑے اور شیر کی طرح گرج کر بولے ”تم بچتے ہو دیکھ لینا روس کو ہرگز شکست نہیں ہو سکتی غریب ہٹلر کو یا کسی کو بچہ بھی نہیں ہے کہ روس کی رزروڈ فوج کتنی کچھ اور کہاں کہاں ہے سائیریا کے پہاڑوں میں ان کے میگزین ہیں جن کی کسی کو ہوائی بھی نہیں پہنچی ہے یہ پسپائی تو روس کا خاص طریقہ جنگ ہے اور ایک فوجی چال کے ماتحت ایسا ہو رہا ہے، جرمن فوجیں

اسٹالن گراؤ تک اسی طرح بڑھتی جاویں گی لیکن پھر وہاں سے پسپا ہونی شروع ہوں گی۔ سیدھی برلن میں ہی جا کر رکھیں گی اور وہاں ہٹلر اور اس کی حکومت کی موت کی آخری رسم ادا ہو جائے گی۔ مولانا نے یہ الفاظ اس زرد اور جوش و خروش سے ارشاد فرمائے کہ ہم ہم سن کر چپ ہو گئے لیکن دل کہہ رہا تھا کہ مولانا کو واقعات و حقائق کے خلاف خواہ مخواہ اپنا پر اصرار ہے۔ اور اپنی رائے کے سامنے کسی کی کچھ سُننے ہی نہیں ہیں۔

بات آئی گئی ہو گئی لیکن معلوم ہے کہ مولانا کا ارشاد جو کسی وحی یا الہام پر مبنی نہیں تھا جس کی بنیاد ان کی عمیق قوتِ مشاہدہ اور گہری بصیرت پر قائم تھی کس طرح حرفِ بخت ثابت ہوا اگر مولانا انگلینڈ یا امریکہ میں ہوتے اور ان کا یہ بیان وہاں کے اخبارات میں شائع ہوتا تو کوئی شبہ نہیں کہ ایک سیاسی مفکر کی حیثیت سے ان کا مرتبہ لائڈ جارج اور بیون اور پنچا تسلیم کر لیا جاتا۔

جنگ میں شرکت اور جنگ شروع ہوئی تو ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کا نگرہیں مسلیم لیگ حکومت کی فوجی مدد جمعیتہ العلماء نے فیصلہ کیا کہ اس جنگ میں حکومت کی کوئی مدد نہ کی جائے نہ اس میں چندہ دیا جائے اور نہ فوج میں بھرتی کے لئے آدمی جائیں لیکن مولانا اس رائے سخت مخالف تھے وہ بر ملا اور بڑے زور کے ساتھ کہتے تھے کہ یہ پالیسی بالکل غلط ہے۔ اس جنگ میں انگریزوں کی مدد کرنی چاہئے۔ چنانچہ ہمارے فاضل اور عزیز ترین دوست (لفٹنٹ کرنل) خواجہ عبدالرشید صاحب جو مولانا سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور شاگرد بھی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں جنگ میں جانا نہیں چاہتا لیکن مولانا نے مجھ کو مجبور کیا فرمایا کہ میں تم کو حکم دیتا ہوں۔ اگر تم نے شمول نہیں کی تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ دہلی میں ابہ مرتبہ مولانا سے ذکر آیا اور ہم نے پوچھا کہ آپ آخر انگریزوں کی اس ظالم حکومت کے ساتھ کرنے پر کیوں تھے ہوئے میں تو فرمایا ”میں حکومت کا ہمدرد نہیں بلکہ خود اپنا اور اپنے کا ہمدرد ہوں لو سنو! بات دراصل یہ ہے کہ اس جنگ کے بعد ہندوستان کا آزاد ہونا

ہو کہ اگر انگریز حیت بھی گئے تب بھی اقتصادی اور فوجی اعتبار سے اور انٹرنیشنل معاملات
 وہ سے وہ اس درجہ کمزور ہو جائیں گے کہ ہندوستان پر اپنی ملکیت قائم نہ رکھ سکیں گے
 انھیں مجبور ہو کر ہمیں خود مختاری دے دینی ہوگی پس اگر یہ یعنی ہے تو ہمیں ابھی سے
 راج اور قومی سول اوٹمنسٹریشن کا انتظام کرنا اور ان کے لئے نوجوانوں کو تربیت دینا ہے
 جی ٹریننگ کی صورت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا
 زیادہ سے زیادہ اپنے نوجوان فوج میں بھرتی کر آئیں فرض کر دو اگر اس طرح ہم نے ایک لاکھ نوجوان
 راج میں بھیجے اور ان میں سے پچاس ہزار مرکھپ بھی گئے تو باقی جو پچاس ہزار بچیں گے
 وہ آزاد ہند کی قومی فوج کے سپاہی ہوں گے جن کے بل بوتے پر ہم حکومت چلا سکیں گے
 اس کے برخلاف اگر ہم نے جنگ میں عدم تعاون کی منقی پالیسی پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ اس کے
 سوا کیا ہوگا کہ کل جب ہم کو آزادی ملے گی تو حکومت کی مشین چلانے کے لئے ہمیں انھیں تنگ
 لادہ کل پرزدوں سے کام لینا ہوگا جن سے آج انگریزی اقتدار کی مشین چل رہی ہے اور
 اس کا جو کچھ انجام ہوگا وہ یہ ہی ہوگا کہ عنوان بدل جائیگا مگر معنوں وہ ہی رہے گا۔ قابل غمت
 ہوگا اگر ڈمنسٹریشن کی روح وہ ہی رہے گی اس بنا پر ضرورت ہے کہ چند ملکوں کی خاطر فوج
 میں بھرتی ہونے والے ہندوستانی نہیں بلکہ ملک کے سچے ہمدرد اور محب وطن اور صحیح فلاح
 ہندو مسلمان نوجوان فوج میں بھرتی ہوں اور اس نیت اور جذبہ سے ملٹری تعلیم حاصل کریں
 کہ اب انھیں جلد ہی قومی فوج کی حیثیت سے اپنے ملک کی خدمت کرنی ہوگی۔

اس خیال اور رائے کے اظہار پر ہمارے مجاہدین آزادی نے مولانا کو کیا کچھ نہیں کہا۔
 ان کو ٹوڈی کہا، رجعت پسند بتایا۔ حکومت کا پٹھو کہا یہاں تک کہ انھیں دنوں میں جمعیت علماء ہند
 اجلاس لاہور میں ہوا اور مولانا وہیں شیرازوالہ میں قیام پذیر تھے تو ان لوگوں نے مولانا سے
 بات کرتی تک گوارا نہیں کی۔ لیکن ذرا سوچتے کہ اگر کانگریس کے رزولوشن۔ جمعیت کے
 نئے۔ اور مسلم لیگ کے اعلان کے مطابق ایک ہندو ایک مسلمان اور ایک سکھ نوجوان

بھی فوج میں شریک ہو کر ملٹری ٹریننگ نہ لیتا تو آج ہماری جمہوری حکومت کیا کاٹ کی پٹی سے کچھ سوا ہوتی۔

ڈومنین اسٹیٹس | مولانا شروع میں ہندوستان کی مکمل آزادی کے سب سے بڑے علمبردار تھے اور اس وقت تھے جبکہ کانگریس کے شعور آزادی کے ناخن میں زندگی کے خون کی جھلک بھی پیدا نہیں ہوتی تھی وہ اسی مشن پر کابل گئے اور دنیا جہان کی خاک جھانتے پھرے لیکن روس، ترکی اور دوسرے نرئی یافتہ آزاد ملکوں کو دیکھنے کے بعد انھوں نے ہندوستان کے متعلق اپنی رائے بدل لی اور بجائے مکمل آزادی کے ابتداء آزادی زیر سایہ برطانیہ کے قائل ہو گئے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کا بچہ مکمل آزادی کے جذبہ سے سرشار ہو رہا تھا اور کانگریس کا ہر کھدر پوش اور حجتہ و مسلم لیگ کا ہر کارکن سب سبست دانی میں اپنے آپ کو جرحل و جمیر لبین سے کم نہیں جانتا تھا اس بنا پر ظاہر ہے مولانا کی اس رائے کو کیا درخور تھا سمجھا جاسکتا تھا۔

مگر مولانا کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انگریز دنیا کی اعلیٰ نرئی یافتہ اور تہذیب یافتہ قوم ہے اور اس کے مقابلہ میں ہندوستانی انتہائی لپست ماندہ ہیں ان میں نہ تعلیم ہے، نہ سیاسی شعور اور اس کی اہمیت ہے اور نہ عوام میں شہری زندگی کے فرائض و واجبات کا احساس ہے علاوہ بریں ہندو مسلم تعصبات و اختلافات اور دوسرے اسباب کی بنا پر ہمارے قومی کیر کر میں چند در چند ایسی خرابیاں اور نقائص ہیں جن پر ایک اجنبی حکومت کے قیام کی وجہ سے پردہ پڑا ہوا ہے ان حالات میں اگر ہم نے مکمل آزادی حاصل کی تو یک بیک ہمارے کاندھوں پر ایک ایسا بھاری بوجھ آ پڑے گا جس کو ہمارے کاندھے اٹھانہ سکیں گے اور اس سے ملک کی سماجی حالت اسے مہر جائے گی۔ مولانا کو کانگریس سے اس بات کی بڑی شکایت تھی کہ اس نے اپنی کوششوں کو صرف انگریزوں کے بیان سے نکال دینے پر مرکوز رکھا ہے اور اس کے علاوہ ملک کی تعمیر کے اہم کام اس نے پس پشت ڈال رکھے ہیں مولانا فرمانے تھے کہ آزادی کے بعد

یہاں جمہوریت یا عوامی حکومت قائم ہوگی لیکن جس ملک کے عوام شہری زندگی کی فطرت پر
کا احساس نہ رکھتے ہوں وہاں جمہوریت سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے اور اس کی وجہ
سے ملک میں بسا اوقات اختلال و خلفشار پیدا ہو سکتا ہے اس بنا پر مولانا کی رائے تھی کہ ہم
کو شروع میں آزادی نہ برساتیے بلکہ برطانیہ یعنی چاہیے تاکہ اس مدت میں ہم اپنے عوام کو تعلیم یافتہ
کر دیں ملک کو صنعتی و حرفتی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ ملک بنادیں یہاں کی اقتصادی حالت
قابل اطمینان ہو جائے اور ملک کے ذرائع پیداوار کا صحیح استعمال کرنا ہم سیکھ جائیں اور
گائے اور ماہر پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنا بھول جائیں تو پھر اس وقت بیشک ہم کو مکمل آزادی
لینی چاہیے اور ہم اس آزادی کے بہمہ وجہ حافظ اور نگراں ہو سکیں۔ گئے مولانا کا یہ خیال صحیح
تھا یا غلط؟ اور اگر صحیح تھا تو کس حد تک؟ واقعات کی روشنی میں آپ خود سوچئے اور
غور کیجئے۔

تقسیم ہند | جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے مولانا کنہر کا گھر سی تھے اور سب سے پہلے مسلمان تھے
جنہوں نے اپنے استاد حضرت شیخ الہندیؒ کی زیر ہدایت افغانستان میں کانگریس کی ایک شاخ
قائم کی اور وہاں کی پبلک تک اس جماعت کی آواز پہنچائی۔ وہ متحدہ قومیت کے بھی قائل تھے
اور ہندوستان کی وحدت کے معترف بھی تھے لیکن جب مسئلہ میں ہندوستان آئے اور یہاں
کی سیاسیات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور ہندو مسلم عوام کے جذبات و رجحانات کو دیکھا ان
کے دلوں کو ٹٹولا اور پرکھا تو وہ تقسیم کے قائل ہو گئے۔ لیکن اس لئے نہیں کہ تقسیم فی نفسہ کوئی
اچھی یا ضروری چیز تھی بلکہ صرف اس لئے کہ ہندو مسلمانوں کے اختلافات اور ان کی باہمی نفرت
وعداوت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ مولانا کے نزدیک اب اس سے انحراف کرنا ایک اور
بڑے فتنہ کو دعوت دینا تھا لیکن اس میں مولانا اس ترمیم کو ضروری قرار دیتے تھے کہ تقسیم
مذہب کی بنیاد پر ہو نہ ہوئی چاہیے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو پاکستان میں ہندو کو اور ہندوستان
میں مسلمان کو اپنے ملک کے شہری اور شریک حکومت کی حیثیت سے رہنا ناممکن ہو جائیگا

اور اس سے جو عظیم بربادی آئیگی ایک مدت دراز تک اس کی غلافی نہ ہو سکے گی۔ معاشرہ و دہم برہم ہو جائے گا اس ملک کی ایک ہزار سال کی تاریخ پر پانی پھر جائیگا بلکہ مولانا کی رائے تھی کہ تقسیم علاقائی کچور کی بنیاد پر ہونی چاہیے جو ہندو اور مسلمانوں دونوں میں مشترک ہے اس سلسلہ میں آپ کا خیال تھا اور صبح تھا کہ شمالی ہندوستان کا کلچر ہندو مسلمانوں دونوں کا ایک ہے یعنی ایک ہی لباس، ایک ہی زبان، ایک ہی انداز معاشرت۔ لیکن اُس میں مسلمانوں کا کلچر غالب ہے۔ اسی طرح جنوبی اور مشرقی ہندوستان کا کلچر ہے جو اگرچہ دونوں فرقوں کا مشترک کلچر ہے لیکن ہندو تہذیب کے عناصر اس میں غالب ہیں مولانا کا خیال یہ تھا کہ اگر اس طرح تقسیم ہوئی تو مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان پورا ہو جاتا ہے اور پھر آپس میں فرقہ وارانہ کشیدگی بھی نہیں پیدا ہوتی، اپنے اس مخصوص نظریہ کے ماتحت حضرت مرحوم کانگرس کے بھی مداح تھے اور لیگ کے بھی۔ اور ساتھ ہی دونوں کے مخالف بھی۔ کانگرس کے اس لئے کہ وہ تقسیم منظور نہیں کرتی، اور لیگ کے اس لیے کہ وہ تقسیم پر بناء مذہب کا مطالبہ کرتی ہے اس بناء پر کلچرل اشتراک و جاسنسٹ کو میل قرار دیکر آپ نے ایک غیر فرقہ وارانہ پارٹی ”سندھ ساگر زبدا“ کے نام سے بنائی تھی اور آپ چاہتے تھے کہ اس پارٹی کے ذریعہ کانگرس اور لیگ دونوں سے ٹریں۔ ہا افسوس! کہ ابھی اس ملک کے آسمان پر آزادی کا سورج طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا اپنے مولا کو میار سے ہو گئے ورنہ آج وہ زندہ ہوتے تو کانگرس لیگ اور جمعیت تینوں کو خواہ مخواہ کر کے فرماتے کہ ”کنفی بنفسٹ الیوم حسدیا“ اور ہم کو یقین ہے کہ کسی کے پاس ان کی بات کا جواب نہ ہوتا۔

مربی بنسٹزم | اس سلسلہ میں ایک اور بات جو مولانا فرمایا کرتے تھے اور جس کو انہوں نے لکھا بھی ہے اور جس کو سن کر ملک کے عوام و خواص ان کو برا بھلا کہتے تھے وہ یہ ہے کہ آپ کے خیال میں ہندوستان کے لئے یہ ہزدوری تھا کہ وہ ٹرکی کی طرح اپنی معاشرت کے پرانے چولے کو اتار کر رکھ دے اور مربی کلچر جس سے وہاں کی قومیت کا خمیر تیار ہوا ہے اسے